



مَسِيح  
کے موت پر  
مختلف پہلو

منصفہ

علامہ ڈبلیو ایچ ٹی گیرڈنر صاحب

ASPECTS OF THE  
REDEMPTIVE ACT OF  
**CHRIST**

BY

Rev. W. H. T. GAIRDNER. B.A

1916

# ASPECTS OF THE REDEPTIVE ACT OF CHRIST

By  
W.H.T. GAIRDNER

مسیح کی موت کے مختلف پہلو  
مصنف

علامہ ڈبلیو، ایچ، ٹی۔ گیرڈنر

1916

April.26.2005

# مسیح کی موت کے

مختلف پہلو

ڈبلیو، ایچ، ٹی، گیرڈنر

ناشر

ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک سٹڈیز، لکھنؤ

## فہرستِ مضامین

مضمون	نمبر شمار
دیباچہ	۱-
پہلا پہلو: مسیح کی موت شریعت کی تکمیل تھی موت زندگی کا دروازہ بن گئی	
دوسرا پہلو: مسیح کی موت آخری دم تک محبت کی تکمیل ہے	۲
تیسرا پہلو: مسیح کی موت ایک بہادرانہ رہنمائی تھی۔	۳
چوتھا پہلو: موت کا مقابلہ کرتے ہوئے اس پر غالب آنے والی مسیح کی موت	۴
پانچواں پہلو: مسیح کی موت خدا سے جنگ تھی	۵

## دیباچہ

ہم مسیحیوں کا ایک عجیب اور حیرت انگیز عقیدہ ہے کہ ایک خاص فعل جو ایک خاص شخص کے ذریعہ سے ایک خاص وقت پر وقوع میں آیا ہر زمانہ کے کل آدم زاد کے لئے نہایت اہم تھا اور اس وقت بھی ہے اس سے ہمارا شاہ سیدنا مسیح کی زندگی موت اور پھر جی اٹھنے کی طرف ہے قریباً دو ہزار سال کا عرصہ گزرا یہ واقعہ معرضِ ظہور میں آیا۔

یہ بات بخوبی عیاں ہے کہ جس فعل کا مرکزی اور اعلیٰ نقطہ خیال موت ہو اور جس کا اثر ایسا عالمگیر ہو اس کو ہم سرسری قرار دے نہیں سکتے بلکہ اس کے برعکس اس کے مختلف پہلو ہیں جن پر الگ الگ غور کرنا ضروری ہو گا اس سے فائدہ ہو گا سرسری نظر ڈالنے سے تو ہم اس کے فوائد سے محروم رہ جائیں گے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ اس سلسلہ میں مسیحی علماء نے مسیح کفارہ بخش موت کی تفسیر کرنے میں اکثر غلطی کی ہے گہرے گہرے معانی دریافت کرنے کے شوق میں دوسرے اور پہلوؤں کے فوائد کو نظر انداز کر دیا گیا اور بعض اوقات تو اس کو محض ایک گر بنا ڈالا یہ عمل اس لئے بھی غلط ہے کہ ان پہلوؤں کی مدد کے بغیر اس کے گہرے معانی کا سمجھنا بھی دشوار ہے ہمیں یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ خدا کے کسی فعل میں صرف ایک ہی پہلو لازمی ہے اور دوسرے پہلو بیکار، فضول اور بطور ضمیمہ اور تہمتہ کے ہوتے ہیں۔ یہ بات نہیں ہے بلکہ سارے پہلو ایک دوسرے سے وابستہ ہوتے ہیں اور ان میں جو سب سے گہرا ہے اس کا بھی دوسروں سے رشتہ ہوتا ہے۔

اس لئے ہم ان اوراق میں ہر ایک پہلو پر الگ الگ غور کریں گے۔ ہم آسان سے آسان پہلو کو شروع کرتے ہوئے بتدریج زیادہ مشکل اور گہرے پہلوؤں کی طرف بڑھیں گے تب جو ایک مجموعی شکل سامنے آئے گی وہ اس فعل کے پورے معنی کو صحیح طورے اجاگر کرے گی۔ اس عمل سے ایک فائدہ یہ بھی ہو گا کہ جن لوگوں کی تربیت ناقص طور پر ہوتی ہے یا روحانی خامی اور ناتجربہ کاری کے باعث زیادہ گہرے پہلوؤں اور باتوں کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے وہ بھی ان پہلوؤں کو باسانی سمجھ سکیں گے اس کا ایک اثر یہ بھی ہو گا کہ ان کے خیالات میں تبدیلی واقع ہوگی۔ ایمان و زندگی پر ایک اثر یہ ہو گا کہ رفتہ رفتہ وہ کمال کی طرف بڑھتے چلے جائیں گے۔

پہلا پہلو

# مسیح کی موت میں شریعت کی تکمیل تھی

## موت زندگی کا دروازہ بن گئی

حضرت مسیح کے پر فضل اور گہرے معانی رکھنے والے اقوال تو بہت سے ہیں ان میں سے ایک قول جو کو ہم یہاں بیان کر رہے ہیں بڑا گہرا ہے اور اس کے معنی بہت وسیع ہیں۔ "جو کوئی اپنی جان بچانے کی کوشش کرے وہ اسے کھوئے گا اور جو کوئی اسے کھوئے گا وہ اس کو محفوظ رکھے گا۔"

اس قول کی اہمیت کا اندازہ آپ محض اس بات سے لگائیے کہ یہی ایک قول ہے جو کہ چاروں انجیلوں میں قلمبند ملتا ہے یعنی چاروں انجیلوں کا اس پر اتفاق ہے پھر یہ بھی ہے کہ چار الگ الگ جگہوں پر مستعمل ہوا ہے۔ چونکہ سیدنا مسیح نے اس قول کو ایک لا تبدیل اصول اور ایک فارمولے کے طور پر نہیں استعمال کیا بلکہ الگ الگ موقعوں میں الگ الگ الفاظ آتے ہیں اور سبق آموز ہیں اس لئے ہم ان موقعوں کا ذکر کرتے ہیں:

مذکورہ بالا قول انجیل لوقا کا ہے (۱۸: ۳۳) اور اس تقریر میں آتا ہے جس میں دنیا کے انجام کا ذکر ہے کہ کس طرح اچانک ہی وہ نوع انسان پر آپڑے گا۔ اس کو ہم نے اس لئے پہلے رکھا ہے کہ اس میں اصول کا ذکر بڑے عام الفاظ میں ہوا "موت زندگی کا دروازہ ہے"۔ اس قول کے استعمال کا دوسرا محل نصیحت کا وہ موقع ہے جب حضرت مسیح نے اپنے بارہ رسولوں کو پہلی بار رسالت و مشن پر بھیجا تھا (دیکھئے متی ۱۰: ۲۹)۔ اس وقت آپ نے فرمایا تھا "جو کوئی اپنی جان بچاتا ہے اسے کھوئے گا اور جو کوئی میرا خاطر اپنی جان کھوتا ہے اسے بچائے گا۔"

پھر جب اس نے اپنے شاگردوں کو پہلی مرتبہ اپنی خبر دی اور پطرس نے اس کو ایسی موت کی راہ سے ہٹانے کی کوشش کی تو وہاں یہ قول اس طرح آیا ہے "جو کوئی اپنے جان بچانا چاہے اسے کھوئے گا اور جو کوئی میری خاطر اپنی جان کھوئے گا اسے پائیگا" (متی ۱۶: ۲۵)۔

آخری مرتبہ یہ قول اس وقت دہرایا گیا جب مسیح کی اٹل اور جلد ہی واقع ہونے والی موت اور قربانی کا سایہ آپ کی روح پر پڑ رہا تھا یعنی اپنے پکڑوائے جانے سے بہ مشکل وہ ایک روز پہلے "جو اپنی جان کو عزیز رکھتا ہے وہ اسے کھو دیتا ہے اور جو دنیا میں اپنی جان سے عداوت رکھتا ہے وہ اسے ہمیشہ کی زندگی کے لئے محفوظ رکھے گا" (یوحنا ۱۲: ۲۵)۔

دوسرے اور تیسرے موقعوں پر یہ الفاظ "میری خاطر" استعمال کئے جانے کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے ماننے والوں سے خود نشاری کا مطالبہ کر رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ اس اصول کی عالمگیری بھی مراد تھی خاص کو چوتھے یعنی آخری آیت کے قرینہ سے تو یہ صاف عیاں ہے سیدنا مسیح نے خاص طور پر یہ اعلان کیا کہ سب سے پہلے یہ اصول خود ان پر ہی عائد ہوتا ہے اور اس کے بعد اس کے تحت اس کے شاگرد آتے ہیں۔ اس لئے ہم ان چاروں عبارتوں کو عام مفہوم میں لیں اور الفاظ "میری خاطر" کو جن سے اس اصول پر ایک حد بندی قائم ہوتی ہے نظر انداز کریں یا اس کے معنی یوں وسیع کر دیں "سارے عالم میں سب سے اعلیٰ اور افضل شے کی خاطر"۔

ان چاروں اقوال میں بظاہر دو خلاف عقول باتیں نظر آتی ہیں اور ان میں سے ہر ایک دو مجلوں میں منقسم ہیں ہماری خاص غرض دوسری خلاف عقول بات سے ہے لیکن اس کے ٹھیک معنی سمجھنے کے لئے پہلی بات کو پرکھنا ضروری ہے پہلی یہ ہے:

جو کوئی اپنی جان بچانے کی کوشش کرے (اسے کھویگا)

جو کوئی اپنی جان بچاتا ہے۔ (اسے کھویگا)

جو کوئی اپنی جان بچانا چاہے (اسے کھویگا)۔

جو کوئی اپنی جان عزیز رکھتا ہے (اسے کھویگا)۔

گویا کہنے کا مقصد یہ ہے کہ آدمی کی زندگی جو اس کے پاس ہے دنیا کی سب سے قیمتی چیز ہے اور وہ بھی ایسی کہ صرف ایک ہی ہے۔ پھر ایسی چیز کی حفاظت تو ہر ممکن طریقہ سے فرض ہے انسان سے اسی بات کی توقع ہو سکتی ہے کہ اس کے بچانے کے لئے اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار ہوگا اس کو پانے کی کوشش کریگا، بچانا چاہے گا۔ اور عزیز رکھے گا لیکن جب یہ سنتے ہیں کہ ایسا کرنے والے اپنا مقصد کھودیتے ہیں اور اس زندگی کے کھونے والے ہی کامیاب ہوتے ہیں تو یہ سن کر تعجب ہوتا ہے کہ آخر ایسا کیوں کہا گیا، ان اقوال کے مختلف الفاظ میں ہی اس سوال کا جواب ملتا ہے زندگی کی قدر و قیمت کا انحصار اس بات پر ہے کہ آخر زندگی کا حاصل کیا ہے؟ وہ کیسے گزرتی اور کس مقصد کے حاصل کرنے میں کوشاں ہے؟ آدمی کی واحد زندگی (زبور ۲۲: ۲۰) انہی باتوں کی وجہ سے قیمتی بنتی ہے چنانچہ اگر کوئی شخص محض زندگی ہی کی خاطر اسے "عزیز رکھنا" اور محض اسی کی خاطر اسے بچانا چاہتا ہے "اور ان امور کا خیال نہیں کرتا اور اس سے محروم ہو کر اسے پابھی لیتا ہے تو وہ اسے کھوتا ہے کیونکہ اسے اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس نے ایسی چیز پالی ہے جو پانے کے قابل نہ تھی ایسی شے کو بچالیا ہے جو بچائے جانے کے قابل نہ تھی اور ایسی چیز کو عزیز رکھا ہے جو عزیز رکھنے کے قابل نہ تھی۔ صحیح طور سے دیکھا جائے تو ہماری زندگی بھی اس قابل نہیں ہے کہ اسے سب کچھ کھو کر حاصل کیا جائے۔

سپارٹا کے ایک سپاہی نے بھی زندگی کو ایسی قیمتی چیز سمجھا تھا اور فارس کی فوج سے اپنی جان بچا کر تھرماپولی کے درے کو چھوڑ کر بھاگ گیا تھا اس نے اپنی جان کو عزیز رکھا اور اس کے بچانے کی کوشش کی حتیٰ کہ اے بچا بھی لیا لیکن جن باتوں کی وجہ سے زندگی قیمتی سمجھی جاتی ہے۔ یعنی وطن کی محبت اور دوسروں کی نگاہ میں عزت یہ سب کچھ تو اس نے کھو دیا تھا۔ گھر واپس آتے ہی فوراً اسے اس بات کا اندازہ ہو گیا سب اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ جس زندگی کو اس نے بچایا وہ تو اس کے کھوئے جانے سے بھی بدتر ہو گئی تھی اس کی زندگی اتنی کمی ثابت ہو رہی تھی کہ اسے آخر کار خود کشی کر لینی پڑی۔

جب یہ بات ہمارے سمجھ میں آگئی تو دوسرا خلاف عقل نظر آنے والا جملہ بھی سمجھ میں آ جاتا ہے یعنی۔

جو کوئی اپنی جان کھوئے (اسے بچائے گا)

جو کوئی اپنی جان کھونا چاہے (اسے پائے گا)

جو کوئی اپنی جان سے عداوت رکھتا ہے (اسے محفوظ رکھے گا)

بظاہر تو خلاف عقل نظر آنے والے اس جملہ کے الفاظ پہلے سے بھی زیادہ ناگوار نظر آتے ہیں لیکن جو سراغ ہم کو مل گیا ہے اسکے ذریعہ اس کا مطلب خوب واضح ہو جاتا ہے یعنی جو کوئی زندگی پر اصول کو ترجیح دیتا ہے وہ اس اصول کو بچاتا ہے۔ جو زندگی کے ایسے مقاصد پر جن کی خاطر اس کو یہ ہستی حاصل ہے اپنی نظر جماتا ہے اور اپنی جان کو خطروں میں ڈال کر بھی اس سے قطع تعلق نہیں کرتا ایسا شخص اس کھونے ہی میں زندگی پاتا، اسے بچاتا اور محفوظ رکھتا ہے۔ پھر ماپولی کے ان بہادروں کی طرح جنہوں نے سپارٹا کی خاطر اپنی جانیں نثار کر دیں اس بات سے ان کی ضمیر نے ان کی تعریف کی اور انجام کار ان کا نام امر ہو گیا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ خود سیدنا مسیح نے اس اصول کو کس طرح استعمال کیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ اس اصول کے استعمال کی کوئی حد نہیں کہ ہمیشہ جسمانی موت ہی کے لئے استعمال ہو مثلاً ایک آدمی کسی اچھے عہدہ کو قبول کرنے سے اس لئے انکار کر دیتا ہے کہ اسکے ساتھ کوئی ذلیل شرط لگی ہوئی تھی اوپر سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنا نقصان کیا اور ایک نفع بخش منصب کے انکار سے اپنی زندگی سے دشمنی کی لیکن حقیقت میں ایسا ہے نہیں بلکہ اس نے اپنی زندگی کو محفوظ رکھا اور بچا لیا کیونکہ اس آزمائش کے بعد اس کی زندگی اور روح میں دس گنا زیادہ مضبوط اور دولت مند ہو جاتی ہے اس کے برخلاف اگر وہ اس عہدہ کو قبول کر لیتا تو اس کی زندگی اور اسکی روح جس کے لئے وہ یہ کرتا مفلس ہو جاتی اور اس پر ایک کاری ضرب لگ جاتی۔ اسی طرح جو مبشر دلی خلوص اور دیانت داری پر شہرت کو، جو فاتح انصاف پر فخر کو، اور جو سوداگر انسانیت پر روپے کو ترجیح دیتا ہے اس کی زندگی آخر کار بیچ ہو جاتی ہے ایسے لوگ ساری دنیا تو پالیتے ہیں لیکن اپنی جان ضائع کر دیتے ہیں اس بیماری جان کو جس کی خاطر اپنے اعلیٰ مقاصد انہوں نے خون کئے تھے۔

چنانچہ معلوم ہوا کہ اس عالمگیر اصول کا ضروری نتیجہ جسمانی موت نہیں ہے ہاں اس کے اعلیٰ استعمال میں یہ موت داخل ضرور ہے اس اصول کا مقصد ہی یہ ہے کہ آدمی نہ صرف زندگی کے لوازمات کو کھونے کے لئے تیار ہو جائے بلکہ اصول کی خاطر عین اس زندگی کو بھی کھولنے کے لئے آمادہ ہو اور اس اعلیٰ صداقت یعنی خدا کو اس جسمانی زندگی پر فوقیت دے۔

اگر سیدنا مسیح کوئی اعلیٰ نمونہ ہے اور اگر اس نے اپنی ہی مقرر کئے ہوئے اصول کا اعلیٰ نمونہ پیش کرنا چاہا تو یہ نمونہ مجازی نہ ہوگا بلکہ حقیقی ہوگا اس نے اعلیٰ نمونہ پیش کیا تو اس پر یہ بھی لازم آیا کہ اپنے اعلیٰ مقصد کو ہاتھ سے نہ جانے دے چاہے اسے قدرتی موت قبول کرنی پڑے۔ اس ترجیح کی صرف اسے آرزو ہی نہ ہو بلکہ تہہ دل سے مرنے پر آمادہ ہو اور یہ ہی نہیں بلکہ مر بھی جائے اگر ایسا نہ ہوتا تو اوپر بیان کی ہوئی خلاف عقل اعلیٰ صداقت ہم پر کیسے ثابت کرتا یعنی "جو خدا کی خاطر فی الواقع مرتا اور اپنی جان کھوتا ہے وہ فی الواقع اسے بچاتا ہے جی اٹھنے سے پہلے اس کے لئے مرنا ضروری تھا اس کی موت اور پر جلالی قیامت کے ذریعہ سے ہی اس سچائی کی تصدیق دنیا کے سامنے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہوگی۔

چنانچہ اس کے لئے تو یہ آیات موت بظاہر ناکامی اور ذلت کی موت ہی کے معنی رکھتی تھیں اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ ہمارے لئے ایک کامل اور اعلیٰ نمونہ بن سکتا اب ایسی صورت میں مسیح کی موت پر یہ اعتراض کرنا کہ اس کے اعلیٰ مرتبہ کے لحاظ سے اس کو ایسی موت شایاں نہیں، کتنا غیر مناسب ہے بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہے ہمارے اس معنی کی تائید خود ان آیات کے قرینہ سے ہوتی ہے۔



دوسرا پہلو

## مسیح کی موت آخری دم تک محبت کرنے کی تکمیل ہے

ہمیں یہ بات ثابت کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے کہ دوسروں کے لئے جاں نثار کرنا اخلاقی طور پر دنیا میں سب سے افضل سمجھا جاتا ہے لیکن موت کے آخری لمحہ تک محبت کرنا ہی اعلیٰ ترین صفت، انسانیت کا خاصہ اور طرہ امتیاز ہے۔

جب ایسا ہے تو یہ بھی ضروری ہوا کہ ابن آدم بھی جو انسان کامل اور پاک تھا، اس صفت کا مظاہرہ کرے پچھلے صفحات میں جو بات کہی گئی اسی طرح یہ بھی ایک بات ہے یعنی یہ کہ مکمل نمونہ دکھانے والے شخص کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ نیکی کے تمام بلند و بالا پہلوں کو اپنی ذات سے ظاہر کرے ورنہ تمام ملکوں اور ہر زمانہ کے لئے وہ کیسے نمونہ بن سکتا ہے یہ جان کر افسوس بھی ہوتا ہے اور تعجب بھی کہ اس کامل انسان یعنی مسیح میں کچھ لوگ اسی صفت کا انکار کرتے ہیں اور اپنے کو بڑا غیر تمند ثابت کرنے والے اور مسیح کی عزت اور اس کے احترام کا دعویٰ کرنے والوں کے منہ سے ایسی بات سن کر اور بھی تعجب ہوتا ہے۔

پھر یہ کہ محبت دنیا میں سب سے بڑی چیز ہے اور اس کا اعلیٰ ترین درجہ اور اظہار زندگی کی آخری سانسوں یعنی موت تک محبت کئے جانا ہے لہذا یہ نہ صرف ممکن بلکہ متوقع امر ہے کہ مثالی انسان سے ایسی ہی شایان شان محبت کے ظہور کی امید کی جائے جو کہ موت تک جا کر منتهی ہو۔ اب جبکہ ایک ممکن امر فی الواقع ہو بھی گیا تو ہمارے لئے سوائے اس کے سامنے سر تسلیم و عظمت خم کر دینے کے اور کوئی چارہ نہیں رہ جاتا۔ مسیح نے اس حقیقت کا اظہار اور تصدیق یہ کہہ کر اپنے ایک قول میں کر دی ہے "اس سے زیادہ محبت کوئی شخص نہیں کرتا کہ اپنی جان اپنے دوستوں کے لئے دے دے (یوحنا ۱۵:۱۳) دوسری جگہ وہ فرماتے ہیں "اچھا چرواہا ہوں۔ اچھا چرواہا بھیڑوں کے لئے اپنی جان دیتا ہے۔ مزدور جو نہ چرواہا ہے، نہ بھیڑوں کا مالک بھیڑیے کو آتے دیکھ کر بھیڑوں کو چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے اور بھیڑیاں کو پکڑتا اور پرانگندہ کرتا ہے۔ وہ اس لئے بھاگ جاتا ہے کہ مزدور ہے اور اس کو بھیڑوں کی فکر نہیں۔ اچھا چرواہا میں ہوں۔ جس طرح باپ مجھے جانتا ہے اور میں باپ کو جانتا ہوں اسی طرح میں اپنی بھیڑوں کو جانتا ہوں اور میری بھیڑیں مجھے جانتی ہیں اور میں بھیڑوں کے لئے اپنی جان دیتا ہوں" (یوحنا ۱۰:۱۰:۱۱)۔

یہ الفاظ ہمیں یاد دلاتے ہیں گزرے ہوئے زمانوں کے سوراخوں کی اور ان کے کارہائے نمایاں کی۔ مثلاً ایک باپ جو اپنے بچے کو بچانے کے لئے ایک جلتے ہوئے گھر میں داخل ہو گیا، یا کسی قبیلہ کے اس فرد کی یاد دلاتے ہیں جس نے اپنے سرداروں کو بچانے کی خاطر اپنی جان کی پروا نہ کی یا وہ جوان جو ڈوبتے ہوئے بچے کو بچانے کے لئے سمندر کی لہروں میں جا کودا، سپاہی جو اپنے دستے کو بچانے کے لئے تنہا ہی اپنی جگہ پر ڈنار جیسے ہزار ہا کارنامے، ہیں جو انسان کی اعلیٰ سے اعلیٰ خوبیوں اور خصوصیتوں کو جن کا وہ مظاہرہ کر سکتا ہے نمونہ پیش کرتے ہیں۔ پھر رضامندی کی موت جس قدر ہولناک ہوگی اتنی ہی پر رعب ہوگی اور اگر برضا و رغبت رضا کارانہ ہونے کے ساتھ ہی یہ موت طویل بھی ہو تو اور پر حشمت ہوگی۔ اور اگر اس سے پیچھا چھڑانا بھی کسی وقت ممکن ہو جائے تو کیا یہ محبت کا کمال نہیں ہے کیا ہم ایسے سوراخ کو عظمتوں کے اعلیٰ سے اعلیٰ تاج نہ نذر کریں گے۔

یہی سب تو ہے کہ جس کے باعث ہم مسیح کی موت کو پر عظمت موت کہتے ہیں یہ ایک ایسی چیز ہے جس سے انکار وہی کر سکتا ہے جو عظمت و جلال کے معنی کا ادراک نہ کر سکتا ہو۔ اسی لئے بائبل کہتی ہے، یسوع (سیدنا عیسیٰ) کو جلال و عزت کا تاج پہنایا گیا ہے تاکہ خدا کے فضل سے وہ ہر ایک آدمی کے لئے موت کا مزہ چکھے" (عبرانیوں ۲:۹)۔ بلکہ یہ کہنا درست ہو گا کہ سیدنا مسیح کو ایسے تاج سے مزین دیکھ کر ہی دنیا کو لفظ محبت کے معنی سمجھ

میں آئے ہیں، ہم نے محبت کو اسی سے جانا ہے کہ اس نے ہمارے واسطے اپنی جان دی اور ہم پر بھی بھائیوں کے واسطے جان دینی فرض ہے (یوحنا ۳: ۱۶)۔ سیدنا مسیح کی اس محبت کے بارے میں ایک اور بے نظیر بات ملتی ہے جس سے ہر شخص کے دل میں یہ خیال گزرتا ہے کہ یہ محبت شخصی تھی اور یہ کہ آپ نے اپنی ذات کو میرے ہی لئے شخصی طور پر قربان کر دیا تھا۔ مقدس پولوس نے بھی اس طرح بیان فرمایا ہے کہ "میں مسیح کے ساتھ مصلوب ہوا ہوں اور اب میں زندہ نہیں رہا بلکہ مسیح مجھ میں زندہ ہے اور میں جو اب جسم میں زندگی گزارتا ہوں تو خدا کے بیٹے پر ایمان لانے سے گزارتا ہوں جس نے مجھ سے محبت رکھی اور اپنے آپ کو میرے لئے موت کے حوالے کر دیا (گلتیوں ۲: ۲۰)۔"

اب دیکھئے کہ اپنے دوستوں یا عزیزوں کے لئے اپنے آپ کو قربان کر دینا اگر محبت کا کمال سمجھا جاسکتا ہے تو اگر یہ قربانی اپنے دشمنوں کے لئے دی جائے تو اس محبت کی بلندی کا کیا کہنا حقیقت تو یہ ہے کہ ایسی قربانی انسانی قدرت و طاقت سے تو باہر ہی ہے ہم رومیوں (۵: ۸ تا ۸)۔ میں یہ پڑھتے بھی ہیں کہ "کسی راستباز کی خاطر بھی مشکل سے کوئی اپنی جان دے گا مگر شاید کسی نیک آدمی کے لئے کوئی اپنی جان تک دینے کی جرات کرے۔ لیکن خدا اپنی محبت کی خوبی ہم پر یوں ظاہر کرتا ہے کہ جب ہم گنہگار ہی تھے تو مسیح ہماری خاطر مواتا۔ ان آیات میں وہ باتیں قابل لحاظ ہیں پہلی تو یہ کہ دشمنوں کے لئے جان دے دینے کا اقرار دوسری یہ کہ دشمنوں اور بدکاروں کے لئے مسیح کی اپنی یہ قربانی خدا کی محبت کا مکاشفہ و ظہور تھا۔ لیکن یہ کیسے ممکن ہے؟ کیا ان لفظوں کے معنی یہ تو نہیں کہ خدا اور مسیح کسی نہ کسی طرح بالذات ایک ہی ہوں۔ کیا ایسا تو نہیں کہ خدا مسیح میں ہو کر دنیا کو اپنے ساتھ ملا رہا ہے (۲ کرنتھیوں ۵: ۱۹)۔ سچ مچ کی خود نثاری خدا کی محبت کا ہی ایک فعل تھا اور دنیا میں یہ سب سے زیادہ عجیب شے ہے۔ خدا کی محبت اور مسیح کی محبت ایک ہی چیز اور ایک ہی بات ہے۔ اور مسیح کی وہ محبت جو موت تک قائم رہی اور گنہگاروں کی خاطر تھی خدا کی محبت کا معیار ہے۔

چنانچہ خدا کے ہاں خود کو نثار کر دینا ممکن ہے اور مسیح کے نجات بخش فعل کے ذریعہ یہ جان نثاری درجہ کمال تک پہنچتی ہے اگر یہ کمال نہ ہوتا تو اخلاق کی ترازو میں خدا انسان سے نیچا ٹھہرتا اس لئے کہ دنیا میں محبت ہی سب سے اعلیٰ و افضل شے ہے کاش ہم لوگوں کی سمجھ میں آئے!

تو ہمارا عنوان بحث یہ تھا کہ زندگی کی آخری سانسوں تک محبت کرتے رہنا انسانی زندگی میں سب سے بڑا قدرتی ظہور ہے خصوصاً اس وقت جبکہ ایسے شخص کے لئے ہو جو اس کا کسی طرح نہ اہل ہونہ مستحق۔ پھر جب یہ سچ ہے تو یہ بھی ناگزیر ہوا کہ سب سے بڑا ابن آدم اور مثالی انسان اور سب سے بڑا نبی جس نے اپنی زندگی اور اپنے اعمال سے بھی وہی ثابت کر دیا ہے جسے اپنے منہ سے کہا کرتا تھا ایسے شخص کو عظمت کا درختاں تاج جان کی بازی لگا کر ہی حاصل کرنا ضروری تھا اس خیال کی وضاحت کے بعد یہ بات بھی صاف ہو جاتی ہے کہ اگر مسیح کے انجام کے بارے میں اسلامی تعبیر درست مان لی جائے تو مسیح کی زندگی کیسی ناقص ثابت ہوگی، جو شخص محض اس بنیاد پر مسیح کی موت کا منکر ہے کہ ایسا ماننے سے اس کی شان پر حرف آتا ہے تو وہ مکمل صداقت کو سمجھ ہی نہیں پایا یعنی صداقت الہیہ کو۔ آئیے ہم بھی رسول کی طرح اقرار کریں کہ یہ ایک سچی اور ناقابل ادراک محبت ہے کہ جس کے آگے سرنگوں ہونا فرض عین ہے۔

تیسرا پہلو

## مسیح کی موت ایک بہادرانہ رہنمائی تھی

عمدہ افسر ہونے کی یہ اولین شرط ہے کہ جنگ میں اسے ہر طرح کے خطروں مصیبتوں اور دقتوں میں اپنے سپاہیوں کا ساتھ دینا اور آگے آگے رہنا ہے۔ ۱۹۱۴ء و ۱۹۱۵ء کی جنگ عظیم میں برطانوری محاذ اور خندقوں میں افسر فوجی دونوں ایک دل اور ایک جان تھے ہر بات میں افسر اپنے سپاہیوں اور ماتحتوں کے شریک تھے بلکہ ماتحتوں سے بڑھ کر خطروں اور موت کا مقابلہ کرنے میں وہ آگے آگے تھے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ جن سپاہ کی کمان ان کے سپرد تھی وہ اپنے افسروں کو حد سے زیادہ پیار کرنے لگے اور ہر طرح کے خطروں میں گھسنے اور ہر جگہ ان کے ساتھ جانے کو راضی رہتے تھے اس کے برخلاف پوز مسل کی شکست کے بعد وہاں جو نظارہ تھا وہ یہ تھا کہ قلعہ بند فوج تو خستہ بے حال اور مصیبت زدہ نظر آتی تھی لیکن افسر بٹے کٹے اور تروتازہ تھے۔ فوجی بیچاروں کو جب چوہوں چوہیوں پر اپنی گزران کرنی پڑ رہی تھی تو اس وقت افسر لوگ بڑے بڑے ہولوں میں گلچھڑے اڑا رہے تھے جب صورت حال یہ تو اگر فوج کوئی قابل فخر کارنامے نہ انجام دے پائے اپنے بچاؤ کے سلسلہ میں یاد شمنوں پر حملے کرنے کے سلسلہ میں تو اس میں چنداں تعجب نہ ہونا چاہیے ہر کامیاب افسر کے لئے ضروری ہے کہ اپنے ماتحتوں میں یہ احساس جگائے کہ جن مصائب کے وہ شکار ہیں ان سے کہیں زیادہ وہ خود ہے۔ سکندر اعظم جب ہندوستان سے بابل کی طرف واپس لوٹ رہا تھا تو اسے بلوچستان کے ریگستان سے گزرنا پڑا وہاں اسے پانی کی سخت قلت کا سامنا کرنا پڑا ساری فوج پیاس کے مارے جاں بلب ہو رہی تھی۔ ایسی حالت میں انہیں بیکار سا چشمہ ملا بڑی مشکل ایک پیالہ پانی دستیاب ہو سکا لوگ اسے سپہ سالار کے پاس لائے جب اس نے اس پیالہ کو منہ لگایا تو بھوکے پیاسے جاں بلب سپاہیوں کی نگاہیں اس پر لگ گئیں سپہ سالار نے وہ پیالہ زمین پر انڈیل دیا اور کہنے لگا میری فوج جو تکلیف اٹھا رہی ہے میں اس سے بچ کر نکل جانا نہیں چاہتا۔ اب دیکھئے کہ جس لشکر کا سالار ایسا ہوا اس فوج کو کیا کہیں جانے سے انکار ہو سکتا ہے۔ بالکل اسی طرح حضرت داؤد نے بھی پانی کا پیالہ خدا کے حضور انڈیل دیا تھا۔ نبولین کی جنگوں میں بھی ایک مرتبہ ایک برطانوی سردار کو ایک زخم کاری آیا تھا اس کے آخری لمحوں میں لوگ اس کی پیاس بجھانے کے لئے ٹھنڈے پانی کا ایک پیالہ لائے لیکن اس نے اس پیالہ کو لینے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ فلاں سپاہی کو دے دو جو قریب کی زخمی پڑا ہوا ہے۔

اب سیدنا مسیح کی مہم بھی ایسی ہے وہ بھی کسی سالار لشکر سے کم نہیں اس کی مہم بھی محنت مشقت دکھ و خطرات موت سے بھری ہوئی تھی یہ ایسی مہم تھی جو شیطان، دینوی ابلیسی ارواح گناہ حتیٰ کہ موت تک کے برخلاف لڑی جا رہی تھی۔ اور سیدنا مسیح ہی اس کے سپہ سالار رہنا تھے اس لحاظ سے بھی کہ نجات کا ابتدائی کام صرف وہی کر سکتے تھے اور کچھ اس لحاظ سے بھی کہ اس کام کو جاری رکھنے کے لئے اس کے ماننے والوں کی ایک فوج بھی ہو یہ بھی خدا کی مرضی تھی۔ اب یہ دیکھئے کہ اخلاقی طور پر بھی اور مناسبت کے لحاظ سے بھی یہ کتنا ضروری تھا کہ انہیں بھی ان دکھوں اور مرحلوں سے گزرنا پڑے جس کی توقع وہ اپنے ماننے والوں سے کرتے ہیں ورنہ وہ اس بات کی توقع کیسے کر سکتے تھے کہ ان کے ماننے والے اس مصائب کی برداشت کے لئے تیار ہوں۔ کتاب مقدس کا نوشتہ بھی یوں ہے "کیوں کہ جس کے لئے سب چیزیں ہیں اور جس کے وسیلہ سے سب چیزیں ہیں اس کو یہی مناسب تھا کہ جب بہت سے بیٹوں کو جلال میں داخل کرے تو ان کی نجات کے بانی کو دکھوں کے ذریعہ سے کامل کرے" (عبرانیوں ۲: ۱۰)۔ یہاں کامل سے مراد ہے پورے طور سے اس کام کے قابل۔ اس سردار کی سب سے بڑی خوبی اس بات میں تھی کہ اس کے بے نظیر و اعلیٰ مہم میں وہ اس کے شایان شان عظیم تکلیف بھی ہے۔

ہمارے وہ بھائی جو اناجیل کے آخری بابوں کے واقعات پر اعتراض کیا کرتے ہیں انہیں اس معاملہ کو اس نقطہ نظر سے دیکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اگر وہ ایسا کریں تو ان کے ناقابل بیان دکھوں کو خلاف عظمت ذلت و شرم کی نگاہ سے نہ دیکھیں گے بلکہ ان کو اس بات سے اتفاق جو یہاں مذکور ہیں کرنا پڑے گا کہ عین ان میں ہی اور ان کے وسیلہ سے ہی "یسوع کو جلال و عزت کا تاج پہنایا گیا" (عبرانیوں ۲: ۹)۔ کیونکہ یہ دیکھ مصائب ہی اس مہلک فہم میں اس ایک اعلیٰ و قابل رہنما بناتے ہیں۔ اب اگر ایسا ہے تو کیا یہ دکھ موت کی صورت میں کمال نہیں حاصل کرتی کیوں کہ موت تو دکھ کی انتہا اور معراج، جان نثاری ہے جس کی توقع ایک سپاہی سے کی جاسکتی ہے۔ ایسے ہی وفاداروں کی کہانیاں تو ہیں جن سے ہمارے دل دھڑکنے لگتے ہیں۔ اگر ہو ریس شاعر یہ گاسکتا ہے کہ "اپنے ملک کے لئے جان دینا کیسا باعظمت و شیریں فعل ہے"۔ "تو لفظ ملک کی جگہ ہم "خدا کی بادشاہی" رکھ دیں تو یہ خیال اس سے کہیں زیادہ سچ ثابت ہوتا ہے۔

ایسے معترضین کو تو جب وہ یہ جان لیں کہ اعلیٰ ترین انسان اور اعلیٰ ترین رہنما ایک بہادر کی موت مر گیا بجائے اعتراض کرنے کے یہ کہنا چاہیے کہ ہاں! میری رائے میں تو اخلاقاً اس کی موت نہایت ضروری تھی اور یہی کتاب مقدس بھی کہتی ہے کہ "یسوع کو موت کا دکھ سہنے کے سبب فرشتوں سے کچھ ہی کم کیا گیا" (عبرانیوں ۲: ۱۹)۔ کیونکہ فرشتے ایسا دکھ سہنے کے قابل تھے کہاں؟ اس لئے اگر کسی اور وجہ سے نہیں تو جسمانی وجوہ کی بنا پر کلام کو مجسم ہونا پڑا اور موت کے قابل بن گیا۔ پھر چودھویں آیت یوں بتاتی ہے "پس جس صورت میں کہ لڑکے خون اور گوشت میں شریک ہیں تو وہ خود بھی ان کی طرح ان میں شریک ہوا"۔ (یہ یاد رکھیے کہ بہت سی فوجوں میں یہ دستور ہے کہ سردار اپنے لوگوں کو بچے کہہ کر مخاطب کرتا ہے) اسی طریقہ کو وہ بھی اپناتا ہے کیوں؟ اس لئے کہ "موت کے وسیلہ سے اس کو جسے موت پر قدرت حاصل تھی یعنی (ابلیس کو تباہ کر دے اور جو عمر بھر موت کے ڈر سے غلامی میں گرفتار رہے انہیں چھڑائے بے شک ایسی مہم کے سپہ سالار کو یہی لازم تھا کہ موت میں اور موت کے ذریعہ سے ہی اپنے لوگوں کی رہنمائی کرے۔ پھر کوئی یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ ایک بڑے جرنیل کو اس طرح اپنے آپ کو جو کھوں میں نہیں ڈالنا چاہیے بلکہ ضرورت تو ایسے زندہ جرنیل کی ہوتی ہے جو مہم کو اپنے انجام تک پہنچا کر چھوڑے۔

ایسا ہی ایک زندہ سپہ سالار تو ہمارے پاس ہے خصوصاً شیطان اور شیطانی کاموں اور برائیوں کی اس جنگ میں۔ مسیحی مذہب تو ہمیشہ انہوں ہی اور متضاد باتوں کو جمع کرتا رہا ہے، ایک طرف تو ہمارا ایک ایسا رہنما ہے کہ جس نے موت کو گلے لگانے کے لئے اپنی جان تک نثار کر دی اس کی مثال ہمارے پاس ہے دوسری طرف وہ رہنما ایسا ہے جسے موت انگلی بھی نہیں لگا سکتی کیونکہ وہ خود فرماتا ہے کہ "خوف نہ کر میں اول اور آخر زندہ ہوں۔ میں مر گیا تھا اور دیکھو ابدال آباد زندہ رہوں گا، آمین! اور موت اور عالم ارواح کی کنجیاں میرے پاس ہیں۔

تو ہمارے اس رہنے موت سے مغلوب ہو کر موت پر فتح پائی اور موت کی یہ درگت نبی کہ بظاہر ایک گھڑی کے لئے تو وہ غالب آئی لیکن ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اسے اپنی طاقت کھو بیٹھنا پڑی۔

چوتھا پہلو

## موت کا مقابلہ کرتے ہوئے اس پر غالب

### آنے والی مسیح کی موت

پچھلی فصل میں مسیح کی موت کی عام خصوصیت و خوبی کو اس نظر سے دیکھا گیا تھا کہ ایک رہبر اور سالار لشکر ہونے کی حیثیت سے آپ نے اپنی ذات پر وہ سب کچھ حتیٰ کہ موت بھی برداشت کی جس کی وہ اپنے ماننے والوں سے توقع کرتے وقت بھی مناسب بھی تھا کہ جیسا کہ خود کلام مقدس کہتا ہے "اس کو یہی مناسب تھا کہ ہمارے نجات کے بانی کو دکھوں کے ذریعہ سے کامل کرے" اس میں موت بھی شامل ہے جیسا کہ بقیہ عبارت سے ظاہر ہے (عبرانیوں ۲: ۱۰)۔

اب ہمارے اس بات سے بحث کرنی ہے کہ وہ مہم کیا تھی اور وہ دشمن کون تھا کہ جس کے ساتھ اس سالار لشکر کو اس کے ہمراہیوں کو لڑنا تھا۔ اس بحث سے اس کی موت اور اس کا تقاضا دونوں ہی اور بھی زیادہ واضح ہو جائیں گے۔

ہاں! تو یہ مہم تھی سلطان موت و گناہ یعنی شیطان کے خلاف اور ان انسانوں کی حمایت میں جو گناہ و موت کی قید میں تھے، اس بات پر غور کیجئے "البتہ اس کو دیکھتے ہیں جو فرشتوں سے کچھ ہی کم کیا گیا یعنی سیدنا مسیح کو کہ موت کا دکھ سہنے کے سبب جلال و عزت کا تاج اسے پہنایا گیا تاکہ خدا کے فضل سے وہ ایک آدمی کے لئے موت کا مزہ چکھے (عبرانیوں ۲: ۹)۔

انسانیت نے یہ مزہ چکھا بلکہ اس کے پیالہ کو تہہ تک چٹ کر گئی۔ بائبل کی تعلیم تو یہ ہے کہ یہ موت واقع ہوئی تھی گناہ کے نتیجے کے طور پر۔ اور گناہ کی آمد ہوئی دنیا میں تاریکی و ظلمت کی طاقتوں کے ذریعہ۔ گناہ کی مزدوری موت ہے (رومیوں ۶: ۲۳)۔ موت انسان کی آخری اور بدترین دشمن ہے۔ لیکن اب ایک سپہ سالار۔ ایک نجات دہندہ کا ظہور ہوتا ہے اقلیم حیات و نور سے تاکہ انسان یعنی اپنی اسیر قوم کو اس سے آزادی دلانے اسی باعث اسے ہر آدمی کے لئے اور ان اسیروں کے لئے موت کا مزہ چکھنا لازمی تھا تاکہ موت پر غلبہ پانے کے بعد وہ انسانیت کو موت کی ہولناکی سے چھٹکارا دلانے۔ اسی فعل میں اس بات کی تشریح بھی ہے کہ مسیح کو اس موت کا یہ تلخ جام کیوں پینا پڑا جو ہر طرح کی ہولناکی کو ہر طرح کے دکھ اور ہر قسم کی روحانی ظلمت حتیٰ کہ آسمانی باپ یعنی خدا سے جدائی کے احساس و شعور کے فقدان کو بھی اپنے دامن میں سمیٹے تھی۔ انہیں وجوہ کی بناء پر اسے پورے جام کو پینا پڑا نہ صرف جسمانی اور طبعی موت کا جام بلکہ معاہدے کے دیگر لوازمات کے ساتھ جو انسان کے گناہ کا براہ راست نتیجہ تھے یعنی اس موت کا جام کہ جس کا مالک خدا نہیں بلکہ شیطان ہے۔

سوال اب یہ ہوتا ہے کہ آخر انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ کیا وہ محض قدرت کے ایک اشارے سے ہی بچ نہ سکتے تھے۔ کیوں نہیں! لیکن اس بات کا دہرا دینا یہاں از بس ضروری ہے کہ یہ تقاضائے محبت ہوتا ہے کہ بچانے والا بھی ان خطروں میں داخل ہو جن میں وہ شخص گھرا ہوا ہے جسے وہ بچانا چاہتا ہے۔ یہی دنیا کی ریت ہے۔ حتیٰ کہ اگر ایسا شخص جسے بچانا ہے خاک میں پڑا ہے تو یہ نجات دہندہ خاک و دھول تک جھک جائے، اگر ڈوب رہا ہے تو یہ سمندر میں کود پڑے۔ اگر آگ میں ہے تو شعلوں میں جا کو دے۔

شائد کوئی یہ سمجھے کہ اچھا یہ تو ٹھیک ہے لیکن مرنے کی کیا ضرورت پڑی تھی۔ سمجھداری کا تقاضا تو یہ ہوتا ہے کہ اپنی جان بچائی جائے تو جواب یہ ہے کہ ہمیشہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ خطروں میں گھرے ہوؤں کو بچانے کی خاطر کبھی جان بھی دینی پڑتی ہے یہ جانتے ہوئے بھی اس بچانے کے فعل کے دوران اس کی جان قربان ہو جائیگی ایسی ہی مثالوں میں تو محبت کا کمال نظر آتا ہے۔ ہم تو پھر بھی یہی کہیں کے کہ نجات و چھٹکارے کی اس جنگ میں سیدنا مسیح کو مرنا لازمی تھا۔

پھر ایک بات یہ بھی تو ہے کہ اخلاقی و روحانی نجات بالکل الگ ہوتی ہے جسمانی و طبعی مخلصی سے۔ پہلی صورت کی خصوصیت تو یہ ہوتی ہے کہ چھٹکارا دینے اور بچانے والا ان سارے خطروں تکالیف و مصائب سے گزرتا ہے جن سے کہ وہ گرفتار بلا کو بچانا چاہتا ہے کیونکہ ایسے موقع پر، دشمن کی حقیقی شکست کا راز اسی بات میں پنہاں ہوتا ہے کہ اسے دل کی بھڑاس نکال لینے دیا جائے اور من مانی کر لینے کا پورا موقع دیا جائے تاکہ اس پر یہ ظاہر ہو جائے کہ اس کی حسرت پورے طور پر نکل گئی اور ان تمام باتوں کے باوجود اس کو شکست نصیب ہوئی ورنہ دشمن یہی کہے گا کہ ابھی تو میرے پاس کچھ اور داؤں یا ہتھیار تھے جن کے ذریعہ میں بچانے والے کو ہرا سکتا تھا دوسرے یہ کہ گرفتار بلا بھی یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو مصیبت و کرب ہم نے سہے وہ تو بچانے والے نے اٹھائے نہیں۔ اس طرح سے تو مصیبت کی کمر ٹوٹی نہیں انہیں وجوہ کی بنا پر مسیح کو ہنسی خوشی موت کے سائے کی وادی ظلمات سے گزرنا پڑا اور ہر روحانی جسمانی نوع کے اخلاقی دکھ و مصائب اور ہولناکی کو اس نے ہنسی خوشی برداشت کیا اور پھر اسے اس تاریکی سے نکل کر روشنی میں آنا پڑا دشمن کی کامل شکست اسی بات میں پوشیدہ تھی کہ اسے گھڑی بھر کے لئے جیت لینے کا موقع دے دیا جاتا۔ لیکن ہوا یہ کہ تیسرے دن مسیح مردوں میں سے جی اٹھا۔ گو کہ یہ بات عجیب سی لگتی ہے۔ لیکن صاحبان فکر و نظر کے لئے اس میں کوئی مشکل نہیں۔

موت کے سلطان نے تو اس سپہ سالار کے ساتھ جو کچھ کرتے بنا کیا لیکن کچھ نہ کر سکا۔ موت نے خود اپنے آپ کو قتل کر لیا اور اب جو رخنہ پیدا ہو گیا تھا اس میں ہو کر اس کے ماننے والے اس میں سے گزر سکتے تھے۔ انسانیت کے نمائندہ نے موت کے ذائقہ کو تمام انسان کے لئے چکھا۔ اب ہر شخص اس پر ایمان لانے کے بعد موت پر فتح حاصل کر سکتا ہے۔ جیسا کہ اگلی عبارت سے ظاہر ہے اس کو جسے موت پر قدرت حاصل تھی ابلیس کو تباہ کر دے اور جو عمر بھر موت کے ڈر سے غلامی میں گرفتار ہے انہیں چھڑائے" (عبرانیوں ۱۱: ۱۵-۱۴)۔

اب یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ لڑکے گوشت اور خون میں والدین کو ملے ہوئے سارے ورثہ اور امراض میں شریک ہیں اسی لئے سالار کو وہ ساری باتیں سہنی پڑیں اور موت میں ہو کر گزرنا پڑا۔ یہ ہے تو بڑی پیچیدہ اور متضاد سی بات لیکن اب سمجھ میں آ جاتی ہے کہ اس طرح سے وہ اب موت کے سلطان کو آسانی سے خاک میں ملا سکتا ہے اس کے زور و اختیار کو توڑ سکتا ہے اور یہ بھی ثابت کر سکتا ہے کہ اس کی اعلیٰ سے اعلیٰ طاقت خدا کی قوت و زور سے بڑی کمتر ہے حتیٰ کہ ایماندار انسانیت کی قوت کاملہ سے بھی کم ہے۔ اس طرح وہ انہیں چھڑا سکتا ہے جو تاریکی و بدی کے اختیار والے شیطان کو دائمی غلامی میں پڑے کر رہے تھے۔ اب دیکھئے کہ محض اس وجہ سے کہ ایسی موت سے مسیح کی تحقیر ہوتی ہے اس کا انکار کر دینا کیسی نا سمجھی ہوتی۔ یہ تو ظاہر ہے کہ انکار کر دینا بڑی بدی دلیل پر مبنی ہے اور ظاہر اذلت کو دیکھ کر اس طرح کا انکار محض اس لئے ہے کہ یہ لوگ روحانی و اخلاقی شان و عظمت کے مفہوم کے سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے حالانکہ حقیقت یہ نہیں بلکہ اس کا مروانہ واران دکھوں کو برداشت کر لینا ہی جلال و عظمت کی تاج پوشی کا باعث ہے اور اسی وجہ سے اس کو ایسا نام دیا گیا ہے جو ہر نام سے اعلیٰ نام تھا۔ (فلپیوں ۲: ۹)۔

پانچواں پہلو

## مسیح کی موت گناہ سے جنگ تھی

پچھلے باب میں اس بات پر اظہار خیال کیا جا چکا ہے کہ موت اور اس کے سلطان (شیطان) سے جنگ کرنے میں اس اعلیٰ انسان کے لئے یہ بات لازم تھی کہ وہ خود مر جائے۔ موت کی کڑواہٹ کا انحصار گناہ پر ہے "اے موت تیرا ڈنک کہا ہے اے موت تیرا ڈنک گناہ ہے"۔ ہم نے ابھی ابھی دیکھا کہ موت کے خلاف جو مہم تھی وہ دراصل گناہ، تمام ناراستی، اور خدا کی شریعت سے انحراف اور بغاوت کے خلاف ایک مہم تھی جس میں نجات دہندہ کی موت کئی وجوہات سے نہایت ضروری تھی۔

### پہلا سبب راستباز انسان کے خلاف ہے

ہم تو یہ جانتے ہی ہیں کہ اس دنیا میں نیکی و راستبازی پر عمل کرنے والوں کا کیا انجام ہوتا ہے وہ ہر طرح کے خطروں سے دوچار ہوتے ہیں، نفع کو قربان کرتے اور ہر طرح کا نقصان اٹھاتے ہیں۔ ان کی ہنسی اڑائی جاتی ہے، عوام ان سے کتراتے ہیں ایسے لوگوں کو ستایا بھی جاتا ہے، خاندان اور سماج سے بھی وہ نکال باہر کئے جاتے ہیں ہر طرح کے ستم و ظلم کا ان کو نشانہ بنایا جاتا ہے حتیٰ کہ کبھی کبھی تو جان کی بازی بھی لگانی پڑ جاتی ہے اور یہی آخری بات ہے جو تمام باتوں کا سر تاج ہے۔ کیونکہ اس سے سارے کر توت اور کارروائی کا راز فاش ہو جاتا ہے دنیا ایسی باتوں کا مقابلہ جان توڑ کر کرتی ہے اور موت اس کا لازمی انجام ہوا کرتا ہے۔ نیکی اور سچائی کی خاطر جسے تھوڑی بھی قربانی کرنی پڑ جائے اس کو موت کے منہ سے گزرنا پڑتا ہے۔ لیکن جو شخص خود ایک مثالی نمونہ کے طور پر ہو اس پر تو یہ اور بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ اپنی ذات اور کارناموں سے یہ ظاہر کرے کہ اس کا مر جانا ہی اصل مقصود ہے۔ یہ تو بڑی عجیب سی بات ہو گی کہ ایک شہید تو اپنے ضمیر کی پاسداری میں جان دے اور ایسا کامل و نیک شخص اعلیٰ شہید کا درجہ نہ پائے۔ یہ ناممکن ہے اس لئے ہم کو گھوم پھر کر اسی بات پر آنا ہو گا کہ مسیح کو اس نقطہ خیال سے مرنا ضروری تھا۔

یہ بات نہ صرف بائبل نے بلکہ انسانی تجربہ نے بھی ظاہر کر دیا ہے۔ افلاطون نے اپنی ایک عبارت میں جو کہ بمنزلہ نبوت پیشین گوئی ثابت ہوئی۔ یہ بیان کیا ہے کہ جب ایک کامل و نیک شخص کی مڈ بھیڑ دنیا کے بدوں کے ساتھ ہوتی ہے اور وہ ان کے مقابلہ میں چٹان کی طرح ڈٹتا رہتا ہے اور دنیا سے کسی سمجھوتے پر راضی نہیں ہوتا تو ایک زبردست کشمکش ہوتی ہے اس جھڑپ میں فتح تو راستباز کی ہوتی ہے اب یہ بات دوسری ہے کہ جسمانی فتح اس کے مخالفین کے گروہ کی ہو کیونکہ یہ لوگ اس وقت تک چین نہیں لیتے جب تک کہ نیک و راستباز آدمی کو ذلیل کر کے مار نہ ڈالیں۔ ستر اط نے اپنے ضمیر کی خاطر ایسی موت برداشت کی تھی افلاطون کو یہ خیال غالباً ہاں سے پیدا ہوا ہو گا لیکن دیکھا جائے تو اس پیشین گوئی کی پوری تکمیل مسیح نے کی ہے۔ افلاطون کی اصل عبارت کا ترجمہ یہ ہے:

راستباز شخص ہو تو بہترین شخص لیکن اسے بدترین سمجھا گیا ہے۔ (دوسری بات یہ دیکھنی ہے) کہ ایسے شخص کی نیکی اسے نادانی سے اور نادانی کے نتائج سے محفوظ رکھتی ہے یا نہیں۔ اب اگر ایسا شخص اپنی موت تک ویسا ہی عمل کرتا چلا گیا ہے تو ایسے راستباز اور نیک شخص کے بارے میں کہ جیسے برا اور ناراست سمجھا گیا ہے لوگ یہ بھی بتائیں گے کہ اس پر کوڑے پڑے، شکنجہ میں کھینچا گیا، اس کے ہاتھ پاؤں باندھے گئے اس کی آنکھیں پٹی ہوئی سلاخوں سے پھوڑی گئیں اور آخر کار ہر طرح کا دکھ دینے کے بعد اسے سولی پر لٹکا دیا گیا (اور اسے صلیب دی گئی ہے)۔"

اب ناظرین کو یہ بات بتانے کی ضرورت نہیں رہی کہ نیکی اور بدی کی جنگ میں اس سارے مضمون کا نچوڑ یہ ہے کہ ایسا نیک آدمی صرف اپنی نیکی اور صداقت کے ہتھیار ہی سے ہمیشہ لیس پایا جائے گا۔

جوں ہی اس نے اس ہتھیار کے علاوہ دوسرا ہتھیار سنبھالا سارا زور جاتا رہے گا اور پھر وہ جنگ ہارے گا اور پھر تو اخلاقی فتح اس سے دور بھاگے گی یعنی آکر اس نے جسمانی تشدد کو اپنا یا کسی اعجازی قوت سے کام لیا تو یہ سمجھ لو کہ وہ اخلاقی طبقے سے نکل گیا اور سارا روحانی پہلو اس کے ہاتھ سے جاتا رہا اور سارا مقصد فوت ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ سیدنا مسیح نے بدی کی اس جنگ میں کسی آسمانی لشکر کا سہارا نہیں لیا (حالانکہ آپ کے ایک شاگرد نے آپ کو اس پر باغ کتسمنی میں ایک مرتبہ ابھارا بھی) آپ نے کسی معجزہ کا سہارا نہیں لیا۔ حالانکہ یہودیوں نے صلیب کے وقت اور شیطان نے بیابان کی آزمائش کے وقت آپ کو اس بات پر ابھارنے کی کوشش کی لیکن آپ نے ایسا ہرگز نہیں کیا بلکہ اس کے برخلاف دنیا کی شدید نفرت و عداوت کا مقابلہ اپنی بے داغ زندگی اور صداقت پر مبنی کامل گواہی سے کیا۔ دنیا نے آپ کو قتل کر دیا اور جسمانی طور پر قتل کرنے سے اور زیادہ کر سکتی تھی لیکن آپ دوبارہ جی اٹھے اور یہ ثابت کر دیا کہ اخلاقی فتح ہی مکمل فتح کہلائی جانے کی مستحق ہے اور اس روح کو جس نے ایسی فتح پائی ہے کبھی فنا نہیں۔ ان باتوں سے قارئین کرام پر یہ بخوبی واضح ہو گیا ہو گا کہ سیدنا مسیح جیسے مثالی راستہ باز کے لئے جسمانی موت کتنی ضروری اور ناگزیر تھی۔

## دوم خود گناہ کی قلعی کھل گئی اور وہ اپنے ہی ہاتھوں قصور وار ٹھہرا

اس یہ نتیجہ نکلا کہ گناہ نے اپنے آپ کو بے پردہ بھی کر دیا اور یہ بھی دکھادیا کہ اس قدوس سے اس مہلک کشمکش میں اس کی اپنی ذات پہچان لی گئی کیوں کہ گناہ اکثر پردہ کے پیچھے رہ کر اور بھیس بدل کر کام کرتا ہے۔ کبھی چھپاتا ہے کبھی بدیوں پر ایسوں کو حسین و جمیل روپ میں پیش کرتا ہے لیکن مسیح کی صلیب پر اس کو برہنہ ہونا پڑا اور جو بے گناہ تھا اسے اس نے تباہ کرنے کی کوشش کی، راستبازی کو ناراستی نے مٹانا چاہا اور بدترین سے بدترین قصور جو تصور میں آسکتے تھے ان کی ایک مجموعی شکل میں اس سلوک میں ظاہر ہوتی جو مسیح کے ساتھ کیا گیا۔ اس طرح گناہ کی قلعی کھل گئی اور اس کی حقیقت و ماہیت بے نقاب ہو گئی کہ کس قدر گھناؤنا، خونی اور دشمن خدا ہے۔ چنانچہ اس جنگ کے آخری مرحلے میں چھلانگ لگانا دیا گیا مسیح نے فرمایا "اب دنیا کی عدالت کی جاتی ہے اب دنیا کا سردار نکال دیا جائے گا (یوحنا ۱۲:۳۱)۔"

کیا یہ ماجرا کھلے طور پر یہ نہیں بتاتا کہ خدا نے کیوں اسے اس سے چھٹکارا نہیں دلایا۔ اگر وہ بچایا جاتا تو کیا گناہ کی حقیقی گھناؤنی صورت سرعام دکھائی جاسکتی تھی؟ یوں گناہ نے خود اپنے آپ کو قصور وار ٹھہرایا "جو اس پر ایمان نہیں لاتا اس پر سزا کا حکم ہو چکا۔ اور سزا کا حکم یہ ہے کہ نور دنیا میں آیا ہے لیکن آدمیوں نے تاریکی کو نور سے زیادہ پسند کیا اس لئے کہ ان کے کام بُرے تھے" (یوحنا ۱۹:۳)۔

کیا اس سے ہم پر یہ حقیقت نہیں منکشف ہوئی کہ مسیح کی موت کے ذریعہ گناہ پر خدا کا فیصلہ اور سزا کا حکم دیا گیا ہے، پیشتر اس کے کہ ہم تیسری وجہ پر غور کریں یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ خدا کا گناہ پر سزا کا حکم اس طور پر ہے کہ خود گناہ کو اپنے ہی ہاتھوں پر یہ حکم لگاتے ہی بن پڑی وہ اس طرح سے کہ جب اس نے اس قدوس پر اپنا سارا غضب انڈیل دیا تو خود ہی اپنے آپ کو صلیب پر چڑھا دیا۔ گناہ پر سزا کے حکم کا دوسرا اور کوئی طریقہ تھا ہی نہیں لہذا ایک مرتبہ ہم پھر اسی نتیجے پر پہنچ رہے ہیں کہ رہنمائے انسانیت اور خدا کے قدوس کے لئے مرنا ہی لازمی تھا۔



## سوم: گناہ پر خدا کا حکم سزا

ہم نے اب تک یہ دیکھا کہ گناہ پر حکم و فتویٰ لگانے کا الٰہی طریقہ یہی تھا کہ گناہ کو کلام مجسم پر اپنا انتہائی ظلم و غضب توڑ لینے دے۔ اب ہم اس عظیم پہلو پر غور کریں گے کہ خدا نے مسیح میں گناہ پر سزا کا حکم لگایا اور اس طرح گنہگاروں سے بھری پوری اس دنیا کے لئے کفارہ کا انتظام کیا۔ "خدا نے اپنے بیٹے کو گناہ آلود جسم کی صورت میں اور گناہ کی قربانی کے لئے بھیج کر جسم میں گناہ کی سزا کا حکم دیا" (رومیوں ۸: ۲) خود جسم انسانی نے گناہ کیا اور خود اس نے ہی گناہ پر سزا کا حکم لگادیا لیکن ہم ابھی بیان کر آئے ہیں کہ ایسی سزا کے حکم کا اظہار پاک انسان پر ہی ہو سکتا تھا یعنی ایسے شخص پر جس نے محبت و ترس کے بارے میں اس مقصد کی خاطر اپنے اوپر جامہ انسانیت پہن لیتا ہے اور مسیح میں خدا کی محبت تھی ہی اس بات میں کہ اپنی بیگناہی و راستبازی اظہار کے لئے اور گناہ کی ناپاکی و قصور واری کے لئے مسیح خود برضا و رغبت ظاہر کرے۔ "ہم نے محبت کو اسی سے جانا ہے کہ اس نے ہمارے لئے اپنی جان دی"۔ (ایوحن ۳: ۱۶) ہاں یہ کمال محبت ہی تو تھی جس نے قدوسیت کے اظہار کا تقاضا کیا اور خود اپنی ذات کو سپر بنایا۔ خدا کی محبت و قدوسیت اس بات کی متقاضی تھی۔ "خدا نے مسیح کو اس کے خون کے باعث ایک ایسا کفارہ ٹھہرایا جو ایمان لانے سے فائدہ مند ہوتا کہ جو گناہ پیشتر ہو چکے تھے اور جن سے خدا نے تخل کر کے طرح دی تھی ان کے بارے میں وہ اپنی راستبازی ظاہر کرے بلکہ اسی وقت اس کی راستبازی ظاہر ہوتا کہ وہ خود بھی عادل رہے اور جو یسوع پر ایمان لائے اس کو بھی راستباز ٹھہرانے والا ہو (رومیوں ۲: ۲۵-۲۶)۔ دیکھئے کہ خدا کا بھی اس میں ہاتھ ہے، یہ سب خدا کی طرف سے ہے جس نے مسیح میں ہو کر ہم سے میل ملاپ کر لیا (۲ کرنتھیوں ۵: ۱۸)۔

مقصد کہنے کا یہ ہے کہ یہ وقوعہ اور اس کا سارا اظہار جیسا کہ مختلف پہلوؤں سے بار بار ظاہر کیا جا چکا ہے موت تک ہی پہنچتا ہے کیونکہ "گناہ کی مزدوری موت ہے"۔ لہذا جس محبت نے اس امر کا اظہار اپنے ذمہ لیا اسے موت پر ہی منتہی ہونا تھا اسی میں خدا اور گنہگاروں کا میل ملاپ ہوا، گناہ دور ہوا، گنہگار راستباز ٹھہرایا گیا۔ جو شخص صلیب پر غور کرتا ہے وہ اس فعل کے ذریعہ یہ جان لیتا ہے کہ خدائے واحد کی ذات مقدس پر محبت ہے، اے گناہ اور راستبازی کا معنی معلوم ہو جاتا ہے اسے یہ بھی احساس ہو جاتا ہے کہ اس گناہ میں اس کا بھی ہاتھ ہے اور خدا کا انصاف اور انسان و گناہ پر فتویٰ اس پر بھی عائد ہوتا ہے اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اسے صلیب کے عمل سے خدا کی طرف سے گناہ کی معافی اور ایک نئی زندگی ملتی ہے۔ اب ایمان کی چٹنگی سے وہ خدا کی طرف سے کئے وعدوں کے مفہوم کو خوب اچھی طرح سمجھ لیتا ہے۔ اب وہ گناہ کو کوئی ایسی ہلکی چیز نہ سمجھے گا جسے خدا یوں ہی نظر انداز کر دیا کرتا ہے اور نہ معافی کو گناہوں کے استحکام کا ذریعہ جانے گا یا یہ کہنے کی جرات کر سکے گا کہ خدا نے تو سب معاف ہی کر دیا ہے اسلئے جتنا بنے گا کیا جاسکتا ہے اور اب خدا کو اس کی کوئی فکر نہیں۔ کیونکہ صلیب پر اس کا تجربہ ہوتا ہے ایک ایسی قدوسیت مطلقہ کا اور خدا کی محبت مطلقہ کا اور جسے وہ اب سے تلاش اور پرستش کرتا ہے وہ مسیح کے ساتھ ہی زندگی کے نئے پن میں پھر سے اٹھ کھڑا ہو۔ وہ گناہ کے لحاظ سے تو مر جاتا ہے اور مسیح میں زندہ ہو جاتا ہے اب اپنی پرستش عزت خوشی اور مرضی چھوڑ کر وہ اب خدا اور اپنے ہمسایوں کے لئے نئے تقدس و بیار میں زندگی گزارنے لگتا ہے جسے اس نے صلیب مسیح پر دریافت کیا ہے۔

بڑے سے بڑا گنہگار بھی صلیب میں حقیقی اطمینان و شانتی پاسکتا ہے خواہ کتنی ہی کثرت اور سیاہی اس کے گناہوں کی، کتنا ہی زخمی کر دینے والا ہو اس کا بوجھ، مسیح نے جب خود گناہ کا اور اس کے سلطان کا سامنا کیا تو ان ہی باتوں کا سامنا سے ہوا۔ اس لئے کوئی خواہ کتنا ہی بڑا گنہگار ہی کیوں نہ ہو وہ ایمان کے وسیلہ اس گناہ بردار کے ساتھ مشابہت حاصل کرتا ہے اور اپنے گناہوں سے سدا کے لئے چھٹکارا پالیتا ہے۔ لیکن جو ایسا کرنے میں ناکام رہا ہے اسے یہ خطرہ رہتا ہے کہ واحد قدوس کے خلاف کرنے والے گناہ کی مشابہت کا مرتکب ہوتا ہے۔ جس نے اس قدوس اور پاکباز کو مصلوب کیا اور جس کو آخر کار وہ راستباز مغلوب کرے گا اور ایک دن نیست و نابود کر دے گا تو غافل شخص کے لئے خود بھی ہلاکت و نیستی کا خطرہ ہے۔